© rasailojaraid.com

تفسیرِ خودی

منظور احسن عباسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعارف

"تفسیر خودی" پر پروفیسر منظور احسن عباسی صاحب کا یہ مقالہ سب سے پہلے ۱۹۷۱ء میں مجلّہ اسلامی ایجوکیشن جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۴ میں چھپا تھا۔ بعد ازاں اسے ایک الگ پمفلٹ کی صورت میں بھی چھاپا گیا جو علمی حلقوں میں بیحد مقبول ہوا۔ چنانچہ ہم نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی محترم موصوف سے اجازت چاہی تو آپ نے بہ کمال مہربانی نہ صرف اس کی دوبارہ اشاعت کی بخوشی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ جگہ جگہ اضافے کر کے مضمون کو اور بھی مفید اور وقیع بنا دیا ہے۔ اس سے وضاحت مطالب میں مزید آسانی پیدا ہو گئی ہے۔

اقبالیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری یہ رائے ہے کہ علامہ اقبال کے تصوّر خودی پر اس سے بہتر تحریر کم از کم میری نظر سے نہیں گذری۔ اسلوب بیان مدلّل اور دلنشیں ہونے کے علاوہ مقالہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ علامہ اقبال کے تصوّر خودی کی ٹھیٹھ اسلامی نقطۂ نظر سے وضاحت کی گئی ہے۔ اگر علاّمہ اقبال اسرار خودی کے دیباچے میں پوری تحدّی کے ساتھ یہ دعوے کرتے ہیں کہ اُن کی فکر کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے تو کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ اُن کے پیش کردہ تصوّرات اور تعلیمات کو اسی اور صرف اُسی انداز سے اخذ کریں۔

مقام مسرّت ہے کہ ہمیں سالِ اقبال میں اس مقالہ کی پیش کش کی سعادت نصیب ہوئی اور ہماری دعا ہے کہ قارئین کرام ہماری اِس پیشکش سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں، تاکہ علاّمہ اقبالؒ کی وہ آرزو پوری ہو سکے، جس کے لئے آپ نے عمر بھر کاوشِ سخن کی۔

مظفّر حسین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیرِ خودی

وحدانیتِ الٰہی کے دو پہلو ہیں۔ غیر اللہ کی الوہیت سے انکار اور اللہ کی الوہیت کا اقرار۔ قرآن حکیم میں اس کو "کفر بالطاغوت" اور "ایمان باللہ" کہا گیا ہے۔ ومن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ۔ "عروہ" "وثقیٰ" یعنی "دستاویزِ مستحکم" سے مراد توحیدِ باری تعالیٰ ہے۔ اور اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ موحد وہی ہے جو کافرِ طاغوت (معبود باطل) اور مؤمن باللہ ہو۔ اسی آیت سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ کفر بالطاغوت کو ایمان باللہ پر تقدم حاصل ہے یعنی جب تک کوئی شخص غیر اللہ کی اطاعت سے انکار نہ کرے اللہ کا طاعت گزار نہیں ہو سکتا۔ کلمۂ طیبہ کی ابتداء میں "لا الٰہ" ہے جس کے معنی کفر بالطاغوت کے ہیں اور اس کے بعد "الا اللہ" ہے جس کے معنی ایمان باللہ کے ہیں اور ان دونوں کے مجموعے کا نام وحدانیت خالص ہے۔

کلمۂ طیبہ اور شانِ رسالت مآب

کلمۂ طیبہ کا آخری جزو "محمد رسول اللہ" بھی وحدانیتِ بحت کی تصدیق و تکمیل ہے محمد رسول اللہ کے معنی یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی اللہ نہیں ہیں۔ کلمۂ طیبہ کا یہ جزو جہاں وحدانیت حق کی تحقیق و تائید کرتا ہے۔ وہیں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان و عظمت مرتبت کو بھی ظاہر کرتا ہے کیونکہ ذات رسالتمآب کی الوہیت کی نفی ان کی ماورائیت کے اندیشہ کو دور کرنے کے لئے لازم تھی۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان ہستی بھی رسالت ہی کے درجہ میں ہے۔ الوہیت کے مقام پر نہیں ہے۔ ضمناً اس میں ان عقائد کی تردید بھی ہے۔ جو بعض اقوام نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی الوہیت کے بارہ میں گھڑ رکھے ہیں اور جن کی تردید قرآن حکیم میں جا بجا کی گئی ہے، غرض رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جزوِ ایمان بنانا بھی تکمیلِ توحید کے لئے لازم ہے۔

قرآن و احادیث کے علاوہ اسلام کا تمام ذخیرۂ علم تصورِ وحدانیت کو "رأسُ الحسنات" قرار دیتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دونوں جہان کی برتری توحیدِ حق کی بنیادوں پر استوار ہے، فلاحِ دین و آخرت کا کوئی بلند سے بلند مقام ایسا نہیں جہاں کمندِ توحید کی رسائی نہ ہو۔

قرآن حکیم کی تمام تعلیم کا نچوڑ اگر ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے تو وہ لفظ 'توحید' ہے جہاں ایک طرف انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی تکمیل، وحدانیت سے وابستہ ہے، وہاں غیر انسانی یا شیطانی زندگی کا ہر گوشہ شرک کی ناپاکی سے ملطخ نظر آتا ہے۔ غرض کوئی نظامِ حیات روحانی ہو یا مادی جب تک اُس میں توحیدِ الٰہی کی جلوہ فرمائی نہ ہو، ناقص اور مہلک ہوگا۔

اقبالؒ اور تصوّرِ توحید

بلاشبہ مفکّرینِ ملّتِ اسلامیہ نے وحدانیت کے تصوّر کو مستحکم بنانے اور شرک کی بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن اگر حقیقت پسندی اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ وحدانیت کے درس کو جس اسلوب سے ذہن نشین کرنے کی اقبالؒ نے کوشش کی ہے وہ کسی اور سے بن نہیں پڑا۔ اقبالؒ کا یہ ارشاد صحیح معنوں میں حقیقت کی ترجمانی ہے کہ:

ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت
ہمچو فکرِ من دُرِ معنی نہ سُفت

اقبالؒ کے افکار میں ہر جگہ توحیدِ حق کی روشنی اور تاریکیٔ شرک سے بیزاری نظر آتی ہے۔ اقبال نے جو راہ وحدانیت حق کی منزل پر پہنچنے کی بتائی ہے اس کا نام "خودی" ہے۔ جس طرح اسلام 'توحید' کو تمام نیکیوں کی جڑ قرار دیتا ہے۔

اُسی طرح اقبالؒ 'خودی' کی پایہ جائی کو تمام محاسن کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ نظریاتِ اقبالؒ کے موضوع پر اب تک اس قدر کتابیں لکھی گئیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں کہ اس کی نظیر اتنے مختصر عہد میں غالباً کسی ایشیائی مصنف کے موضوعِ نظریات میں نہیں مل سکتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خودی اور اقبالؒ

اقبالؒ کی تعلیمات کا نچوڑ اور اُن کے فلسفہ کا عنوان "خودی" ہے۔ خودی سے کیا مراد ہے؟ اقبال کی اپنی تصریحات کے باوجود اِس لفظ کا مفہوم متعین کرنے میں ایک عجیب خلفشار موجود ہے۔ جن اصحاب نے 'اقبال' پر کچھ بھی لکھنا چاہا وہ اُن کے پیغامِ خودی کو نظرانداز نہیں کر سکا۔ لیکن اس میدان کے ہر شہسوار کا رہوارِ قلم اکثر بے لگام ہو گیا۔

ایک اُلجھاؤ

اب یہ نارسائی ذہن کہیئے یا شارحین اقبال کے عالمِ تقریر سے مدعائے اقبال کی عنقایت، کہ لفظ 'خودی' کی بے شمار تعبیرات و تشریحات پڑھنے کے بعد بھی اصل مدّعا کے سمجھنے میں اُلجھاؤ رہا اور ان تشریحات سے یہ نہ سمجھا جا سکا۔ کہ آخر 'خودی' کس کو کہتے ہیں اور اس کے استحکام اور ضعف کی کیا صورت ہے۔ اس کی بلندی و پستی سے کیا مراد ہے۔ کلامِ اقبالؒ میں جو 'خودی' کا لفظ آیا ہے اس کی توصیف تو ہر شخص نے فرمائی ہے کہ خودی کی تکمیل سے انسانی صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہوتی ہے اور اس کے نتائج بڑے ہی شاندار ہیں۔ یہاں تک کہ انسان ملائِ اعلیٰ سے بلند تر مرتبے پر پہنچ جاتا ہے اور دنیوی اقتدار، اقبال مندی اور سلطنت اس کا قدم چومنے لگتی ہے۔ اس میں خدا کی صفات جلوہ گر ہو جاتی ہیں اور تمام کائنات اُس کے تحتِ تصرف میں آجاتی ہے۔ وغیرہ، خودی کے باب میں اِس حسنِ عقیدت کے ساتھ ساتھ کاش کوئی صاحب یہ بھی بتا دیں کہ خودی کیا شے ہے؟ اور انسان کے روحانی مدارج کی برتری اور دنیوی اقتدار کے حصول کو لفظ 'خودی' کے مفہوم سے کیا نسبت ہے؟ اور ان صفات عالیہ کو لغوی یا اصطلاحی لحاظ سے اس لفظ پر کیوں کر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور ابہام

یہ امر بھی مبہم ہے کہ آیا خودی کوئی جامد تخیل ہے یا تدریجی عمل یا دونوں کے مجموعے کو اقبال نے خودی فرمایا ہے؟ پھر بعض اصحاب نے کائنات کی ہر چیز اور خالق کائنات کے لئے بھی الگ الگ خودی کا ذکر فرمایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ تو کیا اُن میں سے ہر ایک کی خودی کا یہی حال ہے۔

ایک طرف تو جناب ڈاکٹر قاضی عبدالحمید زبیری صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی کا یہ ارشاد ہے کہ:

"افراد و اقوام و انسانیت کی طرح بحیثیت مجموعی کل کائنات کی بھی ایک خودی ہے۔ کائنات کی اس خودی کو مذہبی اصطلاح میں خدا کہا جاتا ہے۔"

دوسری طرف جناب بشیر احمد انصاری بی۔اے جامعہ یہ فرماتے ہیں کہ:

"ایک مستقل تڑپ ایک پیہم خلش اور ایک نہ فنا ہونے والا احساسِ خودی سرمایۂ حیات ہے۔"

اقبال نے جس خودی کو اتنا بلند کرنے کے لئے کہا ہے کہ اس کے نتیجہ میں خدا انسان کی تقدیر اس کی مرضی پوچھ کر بناتا ہے۔ آخر کیا یہ وہی خودی ہے جس کو مذہبی اصطلاح میں خدا کہا جاتا ہے اور یہ اصطلاح مذہب کی کون سی کتاب میں ہے یا پھر یہی وہ خودی ہے جس کا نام احساس خودی کی مستقل تڑپ ہے۔

پروفیسر اربری (ARBERRY) جس نے اقبال کی تالیفات اسرار خودی اور رموز بے خودی کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ لفظ خودی کے معنی (SELF AFFIRMATION) لکھتا ہے۔ یعنی اپنی ہستی کا اعتراف واقرار۔ اور وہ بھی یہی رٹ لگا رہا ہے کہ اخلاقی اور مذہبی معیارِ بلند انکارِ خودی نہیں بلکہ اقرار خودی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تصریح نہیں کرتا کہ آخر دنیا میں وہ کون احمق ہے جو اپنی ہستی سے انکار کرتا ہے۔ اور آیا وہ کون سا کارنامۂ حیات ہے کہ انسان اپنی ہستی کا محض اقرار کر لینے سے روحانی اور مادی ترقی کے تمام مدارج طے کر سکے۔

اس خیال کو فلسفیانہ مبہمات یا سوفسطائیانہ مزخرفات کے گورکھ دھندوں میں اُلجھا کر آپ کا جو جی چاہے کہتے چلے جایئے۔ لیکن خودی کی اس تعبیر کو روحانی و مادی برتری کا وسیلہ قرار دینے کے لئے ہر قدم پر وضاحت در وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی رہے گی۔ لفظ 'خودی' کا مفہوم متعین کرنے کے لئے سب سے زیادہ صحیح طریق کار یہ تھا کہ ہم خود 'اقبال' کی طرف رجوع کرتے کہ انہوں نے اس کے کیا معنی بتائے ہیں؟

لفظ خودی کے لغوی معنی

لفظ خودی کے لغوی معنی غرور، نخوت اور تکبر کے ہیں۔ لیکن اقبال نے اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں فرمایا۔ بلکہ تردید کی ہے اور اپنی کتاب اسرارِ خودی کا تعارف کراتے ہوئے دیباچہ میں یہ بتایا ہے کہ خودی کے معنی غرور کے نہیں بلکہ احساسِ نفس کے ہیں اور یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ میرے خیالات یا فلسفۂ خودی (اگر اس کو فلسفہ ہی کہنا ضروری ہو) خود مسلمان صوفیاء اور علماء کے مشاہدات سے ماخوذ ہیں۔ تاہم انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ خودی کے معنی غرور کے نہ ہونے کی کیا دلیل ہے۔ درآنحالیکہ فارسی زبان کے اس لفظ کے معنی تمام لغات کی کتابوں میں یہی بتائے گئے ہیں۔ بظاہر اقبال نے اہلِ لغت کے بتائے ہوئے معنوں کو اصطلاح پر مبنی تصور فرمایا ہے۔ حقیقت و ماخذ کی رو سے یہ لفظ خود سے باضافۂ ہائے نسبتی خودی بنا ہے۔ خود کے معنی "أنا" یا (SELF) کے ہیں اور خودی سے مراد ہر وہ تصور ہے جس کا تعلق اپنی ذات سے ہو۔ لہٰذا خودی کے مفہوم میں خود پسندی اور خودشناسی کو بہرحال دخل ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ بالفاظ اقبال احساسِ نفس ہی ہو سکتا ہے۔ اور اقبال نے خودی سے معرفت نفس ہی مراد لیا ہے۔ ولکلٍ اَن یَّصطلح ٥

معرفتِ نفس

کہا جاتا ہے کہ بعض صحائف قدیمہ میں معرفت نفس ہی کو معرفت الٰہی کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے نظریہ کو اکثر صوفیا و متکلمین نے منزل سلوک کا رہنما قرار دیا ہے۔ اکابر متکلمین میں سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب کیمیائے سعادت کے آغاز میں معرفت نفس پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔ اور جو کچھ اس میں بتایا گیا ہے اس کی تلخیص یہ ہے کہ:

> "انسان کو اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنی چاہیئے۔ جو لوگ خود کو نہیں سمجھتے وہ اور اشیاء کو کیوں کر سمجھ سکتے ہیں؟ نفس کی معرفت یوں تو ہر ایک کو ہے۔ لیکن حقیقی طور پر معرفتِ نفس دل کا پہچاننا ہے۔ دل بڑی چیز ہے۔ دل کا معرفت ہی تسخیرِ کائنات ہے۔ دل والے تمام جہان کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ حقیقتِ مرگ جسم کا زوال نہیں بلکہ دل کا زوال ہے۔ انسان کو عناصر کا غلام نہ ہونا چاہیئے۔"

ظاہر ہے کہ یہ تمام مطالب وہی ہیں جو بیشتر شعرِ اقبال کے عنوانات ہیں۔ بایں ہمہ معرفتِ نفس کا وہ پہلو جس کو خصوصیت کے ساتھ اقبال نے پیش نظر رکھا ہے۔ امام غزالی ہی نے نہیں بلکہ جہاں تک عام فہم و ادراک کا تعلق ہے۔ علماء و حکمائے ملت میں سے کسی نے اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں فرمائی۔ حالانکہ وہ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش پاافتادہ حقیقت اور پشت پا سے زیادہ واضح امر ہے۔

معرفتِ نفس اور علمائے اُمّت

معرفتِ نفس کا مطلب علمائے اُمّت نے بالفاظِ غزالی یہ بتایا ہے کہ "انسان کو اپنی حقیقت کا پہچاننا ضروری ہے یعنی وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، اس کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ اس کے معرضِ وجود میں آنے کی غرض کیا ہے۔ انسانی سعادت کس میں ہے اور خسارہ کی کیا بات ہے وغیرہ" اقبال کے پیغام میں یہ تمام باتیں ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک یہ سب کچھ ایک اصل کی شاخیں ہیں اور اصل اس کی وحدانیتِ حق ہے۔ یعنی خدا کی خدائی میں کسی کو شریک نہ کرنا۔" اقبالؒ کے نزدیک اِس حقیقت کا سرچشمہ خودی یا معرفتِ نفس ہے۔

معرفتِ نفس اور خودی

خودی کے معنی بلاشبہ خود کو پہچاننا یا خود پسند ہونا ہے۔ لیکن خود پسند ہونے کا مطلب اقبالؒ کے نزدیک 'تکبّر'، و 'انا' و 'خود پرستی' نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ انسان خود کو معرضِ تلف میں پڑنے اور اپنی انسانیّت کو معرضِ تلف میں ڈالنے یا ذلیل و رسوا کرنے سے بچائے۔ اس کا نہایت سادہ مگر فطری طریقہ وہی ہے جس کی طرف کلام الٰہی نے رہنمائی فرمائی ہے کہ کافر بالطاغوت ہو یعنی کائنات کی کسی شئے کو قابلِ پرستش نہ بنائے اور خود کو اپنے مقام سے گرنے نہ دے۔

اقبالؒ کا درسِ خودی

آیاتِ قرآنی کی روشنی میں کلامِ اقبال پر نظر ڈالنے سے عیاں ہوگا کہ اقبال کا درسِ خودی آیت تسخیر یعنی "سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض" کی تفسیر ہے۔ کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خالق کائنات نے ہر شئے کو انسان کے لئے مسخر بنا کر اُسے سب پر نہ صرف یہ کہ شرف بخشا ہے بلکہ تمام کائنات کا مخدوم بنا دیا ہے۔ اس فضل و شرف کا احساس ہی دراصل خودی ہے اور انسانیّت کی بقا اسی احساس پر منحصر ہے یعنی جو لوگ اس انسانی احساس فضل و شرف کو نظر انداز کر کے خود کو اپنے خدّامِ مسخر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی غلامی میں ڈال دیتے ہیں وہ دراصل رتبۂ انسانیت سے گر جاتے ہیں۔ یہ خود کو پسند کرنا نہیں بلکہ خود کو ذلیل کرنا ہے۔ چنانچہ ساجدینِ شمس و قمر اور پرستارانِ گاؤ شتر اگر انسانیت کی انتہائی پستی کے مظاہر نہیں تو اور کیا ہیں؟ قرآن حکیم نے اس مقصد کو واضح کرنے کے لیے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ ذکر فرمایا ہے، کہ بنی اسرائیل کی اس درخواست پر کہ ہمارے لیے بھی کوئی معبود ایسا بنا دیجیے جیسا کہ عاکفین اصنام نے بنا رکھا ہے حضرت موسیٰ نے اس خواہش کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا۔

"أغير الله أبغيكم إلهاً وهو فضلكم على العالمين" (اعراف - ۱۴۰) یعنی اے نوعِ انسان تم تو خود سارے جہان سے افضل ہو، بھلا اللہ کے سوا اور کون ہے جس کو تمہارے لیے معبود قرار دیا جا سکے۔

اے ز آدابِ امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر

(اسرار ص۵۷)

اقبالؒ کے نزدیک یہ ایک ایسا واضح مسئلہ ہے جس کے سمجھنے میں مطلقاً کسی کاوشِ نظر کی ضرورت نہیں۔ اس کے مقابلہ میں جہان کے دوسرے مسائل کا سمجھنا بہت دشوار ہے۔

جہاں پنہاں و محتاجِ دلیلے
نمی آید بہ فکر جبرئیلے

خودی پیدا ز حجت بے نیاز است
یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز است

یعنی دنیا سمجھ میں نہ آئے تو نہ آئے، آخر اپنے آپ کو سمجھنے میں کیا قباحت ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا اقبالؒ کہتے ہیں کہ خودی کا مسئلہ کوئی دور از کار فلسفہ نہیں ہے ظاہر ہے کہ اے انسان!

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود فراموشی

انسان جس کو اپنی خودی پسند ہے۔ وہ زمینی اور آسمانی اشیاء کے آگے ہرگز سربسجود نہیں ہو سکتا، اسی کا نام "کفر بالطاغوت" ہے اور یہی ایمان باللہ کی بنیاد ہے۔

اِس مدّعا کی وضاحت کے لئے اقبالؒ اس عالم رنگ و بو کے فراموش کار انسانوں کی روحِ خفتہ کو یوں بیدار کرتے ہیں۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟

یعنی کتنا خود فراموش کار ہے وہ انسان جو مہر و مہ و انجم سے فائدہ اٹھانے کی بجائے ان کی الوہیت کو تسلیم کرلے اور خود اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔ غرض جو لوگ خود کو سمجھتے ہیں وہ اپنی خودی کو ماسوا اللہ کا نیازمند ہونا پسند نہیں کرتے۔ قرآن فرماتا ہے۔ "اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (بقرہ)

سعدیؒ نے اسی مضمون کو یوں ادا فرمایا ہے:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نہ بری

سعدیؒ کا انداز و استفانہ ہے اور اقبالؒ کا بیان فلسفیانہ لیکن مدّعا دونوں کا ایک ہے۔ یعنی سب کچھ انسان کے لیے ہے تو انسان کو بھی چاہیئے کہ وہ اللہ کا ہو کر رہے۔ اور غیر اللہ کا ہو کر نہ رہ جائے۔

ترکِ خودی شرک ہے

اصل مفہوم آیت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں جبکہ انسان کی خدمت میں مصروف ہیں، تو ان میں سے کوئی چیز بھی معبود کی شریک نہیں ہو سکتی۔ بالفاظِ دیگر جب انسان کو خودی کا احساس ہو جائے یا اپنی معرفت حاصل ہو جائے کہ وہ خود کائنات میں سب سے اشرف و اعلیٰ ہے تو اب کیسے ممکن ہے کہ اس کا سر معبودِ حقیقی کے سوا اور کسی کے سامنے جھک سکے۔ گویا خودی یا معرفت نفس بجائے خود کفر بالطاغوت کا مقدمہ ہے۔ اقبالؒ نے اس کو توحید کا وسیلہ قرار دیا ہے :

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

طلسمِ رنگ و بو سے مراد اشیاءِ کائنات کی ماورائیت ہے، اس کو توڑنا ہی کفر بالطاغوت ہے اور عملاً ابنائے نوع کا اس طلسم میں پھنسا رہنا خودی سے غفلت اور سرِ توحید سے ناواقفیت کے مترادف ہے۔ بقول اقبالؒ سہ

از رموزِ زندگی آگاہ شو
ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو!

انسان کی فقید البصری

اس باب میں انسان کی فقید البصری کا ذکر قرآنِ حکیم میں اس طرح کیا گیا ہے "بل الانسان علیٰ نفسہٖ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ۔" (قیامہ)

یعنی فی الواقع انسان بنفسِ خود وحدانیتِ حق کی دلیل ہے۔ لوگ خفیہ کی کتاب ہے لیکن نہیں سمجھا۔ اقبالؒ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارمغانِ حجاز میں تصویر و مصوّر کا ایک مکالمہ لکھا ہے۔ تصویر کہتی ہے کہ ــــــ "اے مصوّر تیرا کمال تو مجھ سے ظاہر ہے تو خود میری نظر سے مخفی کیوں ہے ؟ مصوّر جواب دیتا ہے کہ :

تُو ہے میرے کمالاتِ ہُنر سے
نہ ہو نومید اپنے نقش گر سے
مرے دیدار کی ہے اِک یہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

یعنی مجھے کوئی کیوں کر پہچانے جب تک کہ خود کو نہ پہچان سکے اور خود کو پہچاننا یہ ہے کہ اپنے اُوپر ظلم نہ کرے اور انسان کا اپنے نفس پر سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْم (لقمان ۱۳) کیونکہ مشرک انسان اپنی خودی کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ اس مضمون کو اقبالؒ نے ایک منظوم تمثیل میں اس طرح بیان کیا ہے ــــــ "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" :

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
ناپید تیرے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

تعمیرِ خودی کی صحیح تعبیر

تعمیرِ خودی یہی ہے کہ کائنات کی کسی شے کی عظمت انسانی خودی کو مجروح نہ کر سکے۔ کیونکہ انسانیت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شرف اللہ کے سوا کائنات کی کسی شئے کو مقصدِ حیات قرار دینے کے منافی ہے جبکہ تمام کائنات اسی کے لئے ہے تو وہ خود اُن میں سے کسی کے لئے نہیں ہو سکتا۔

تخریبِ خودی کے اسباب

انسان جس حد تک خود کو کائنات کے لئے وقف کرے گا۔ اسی حد تک وہ اپنی خودی کی تخریب کا ذریعہ بنتا جائے گا۔ اقبال نے اپنے فکری تخلیقات میں جابجا اشارہ کیا ہے کہ انسان کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ اس میں مخدوم و مُطاعِ کل بننے کی صلاحیت ہے۔ لیکن خادم و مطیع بجز اللہ کے وہ کسی کا نہیں ہے۔

ضعفِ انسانی موجبِ شرفِ انسان ہے

آیاتِ قرآنی "خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفاً" بھی اسی دعوے کی ایک دلیل ہے۔ بظاہر اقبال نے اس آیت سے کسی مقام پر استشہاد نہیں کیا، لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ انسانیت اپنی حیات وبقاء وارتقاء کے لیے تمام جہان کی محتاج ہے اور کوئی چیز اس کی محتاج نہیں ہے۔ یعنی کائنات کی تمام اشیاء انسان کی زندگی اُس کے وجود اور ترقی کے سامان ہیں۔ ان میں سے کسی کی ہستی کا انحصار انسان کے موجود ہونے پر نہیں ہے۔ لیکن انسان ان میں سے ہر چیز کو اپنی بقاء اور ترقی کے لئے کام میں لا سکتا ہے۔ اسی کو ہم فطری ضعف کہتے ہیں۔

علامہ راغب اصفہانی نے اس آیت میں لفظ "ضعف" کی توجیہہ اس طرح فرمائی ہے کہ:

"ضعفہ کثرۃ حاجاتہ" یعنی انسانی ضروریات کی کثرت ہی اس کے ضعف کی دلیل ہے۔ انسان کا یہ فطری اور خلقی ضعف انسان کو جملہ مخلوقات سے استفادہ کا فطری حق بھی دیتا ہے اور یہی اس کے شرف کا موجب اور احساس خودی کا محرک بھی ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ:

ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست
جملہ موجودات را فرمانرواست

یعنی زمین اور آسمان کی ہر چیز انسان کی مطیع [illegible] سے انکار کرنے والے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی کو یہ حق ہے کہ وہ کائنات کا فرمانروا بن سکے۔ نہ یہ کہ خود کو اسی کی غلامی میں ڈال دے۔

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

خودی شیرِ مولا جہاں اُس کا صید
زمیں اُس کی صید آسماں اُس کا صید

خودی صیاد و نخچیرش مہ و مہر
اسیرِ بندِ تدبیرش مہ و مہر

(زبورِ عجم ص۲۱۴)

طلسم مہر و سپہر و ستارہ سے مراد ان اشیاء کی ماورائیت کا تصوّر ہے جس نے الوہیت کا رنگ اختیار کر لیا۔ اجرام سماویہ کی پرستش کرنے والوں کی گمراہی کا اصل موجب صرف یہ تھا کہ انھوں نے خود اپنے مقام کو نہ پہچانا۔ یہ نہ سمجھا کہ وہ ان تمام موجودات سے افضل و اشرف ہیں تو ان کے پرستار کس طرح ہو سکتے ہیں۔

اِنسان مخدومِ کائنات ہے۔

کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ ہر شئے نوعِ انسان کے لئے ہے۔ آفتاب اس کا طبّاخ، چاند مشعلچی، ستارے صنّاع، حیوانات کارندے، نباتات فرّاش اور جمادات خازن و صرّاف ہیں۔ انسانیت کسی نہ کسی طرح تمام اشیائے کائنات کو اپنے مقاصد کے لئے بے روک ٹوک کام میں لا رہی ہے۔ اور لاتی جا رہی ہے تو کیا ان میں سے کوئی ایک شئے بھی ایسی ہے۔ جس پر انسانیت کو قربان کیا جا سکے اسی کا نام تحفّظِ خودی ہے۔ واضح ہو کہ تصوّرِ خودی کے اس مقام پر پہنچ کر ہی انسان بالجزم غیر اللہ کی معبودیت سے انکار کر دیتا ہے اور قرآن حکیم سے عیاں ہے کہ یہ انکار ہی معرفت حق یا ایمان باللہ یا توحید کا مقدمہ ہے اور یہی اقبال نے کہا ہے کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تا نہ رمز لا الہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

براھیمی نظر

حقیقت یہ کہ انابت الی الحق کی راہ کا سب سے اہم موڑ کائنات کی فنا پذیری اور بے حقیقی ہے اور یہیں سے "الا اللہ" کا پیکرِ نورانی اپنی صدائے دلنواز کے ساتھ جنت نگاہ اور فردوس گوش ہو کر فطرت سلیمہ کو "قالوا بلیٰ" کے اسرار سے آشنا کرتا ہے

جہاں یک سر مقامِ آفلین است
دریں غربت سرا عرفاں ہمیں است

(زبور عجم ص ۲۴۱)

یعنی بے حقیقتی ما سوا اللہ سے معرفت حق حاصل ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسانیت براھیمی نظر سے محروم رہ جاتی ہے۔

در محبت پختہ کے گردد خلیل؟
تا نہ گردد لا سوئے الا دلیل

یعنی انسان جب تک حضرت ابراہیم کی طرح کا فرِ طاغوت نہیں ہوتا۔ ایمان باللہ کی لذت نہیں پاسکتا۔ حضرت اکبر الہ آبادی اس باب میں اقبال کی ہم نوائی یوں کرتے ہیں۔

یہ عشق ہی ہے کہ منزل ہے جس کی الا اللہ
خرد نے صرف رہِ لا الٰہ پائی ہے

تصورِ خودی کا مقصد اقبال کے نزدیک یہی ہے۔

کسے کو بر خودی زد لا الہ را
ز خاکِ مردہ رویاند نگہ را

مدہ از دست دامانِ چنیں مرد
کہ دیدم در کمندش مہر و مہ را

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی جو شخص شرک سے بیزار اور خالص توحید کا علم بردار ہو وہ مسیحائی اعجاز کا حامل ہوتا ہے۔ ایسے موحد کا دامن نہ چھوڑنا چاہیئے۔ پھر اسی مضمون کی وضاحت اقبالؒ نے اس سوال و جواب کے پیرایہ میں کی ہے۔

سوال :-

کہ رشتہ بر سر وحدت واقف آخر ؟
شناسائے چہ آمد عارف آخر ؟

یعنی سوال یہ ہے کہ آخر توحید و معرفت الٰہی کس شے کا نام ہے ؟

جواب :-

جہاں یکسر مقام آفلین است
دریں غربت سرا عرفاں ہمین است

دلِ من در تلاش باطلے نیست
نصیبِ ماغمِ بے حاصلے نیست

خودی را لازوالے مے تواں کرد
فراقے را وصالے مے تواں کرد

یعنی معرفت یہ ہے کہ تمام جہان کی معبودیت سے انکار کرکے معبود برحق کو ڈھونڈلایا جائے اور تب ہی خودی یعنی عزتِ نفس اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ سکتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک یہی نقطۂ ماسکہ تباشیر نبوت میں سے ہے۔

غارِ حرا کے واردات

غارِ حرا کے وارداتِ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم معناً ہرا ہیمی تفکر و نظر کے مماثل تھے۔

مصطفےٰؐ اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقش ما را در دل او ریختند
ملتے از خلوتش انگیختند

یعنی قلبِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے پہلے معرفت نفس (یعنی خودی) نے جو مستلزم ہے۔ مفہوم لا الٰہ کو الا اللہ کا نقشہ جمایا اور نتیجۃً لا الٰہ الا اللہ کا کلمۂ حق بلند کرنے والی ایک قوم معرض وجود میں آگئی۔ اقبالیات کے ایک مستند مفتش نے ان اشعار کے قالب میں ایک نئے فلسفہ کا سراغ لگایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اگر خلوت نشینی میں خود اپنی ذات یعنی خودی کا مشاہدہ کیا جائے تو انسان کو اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ اور اس صورت میں عشق عقل کی طرح صرف تحقیقی قوت نہیں رہ جاتا بلکہ ایک تخلیقی جذبہ بن جاتا ہے اور انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی روحانی طاقت سے کام لے کر ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حرا میں خلوت نشین ہو کر خود اپنی ذات یعنی خودی کی تخلیقی قوتوں کا مشاہدہ کیا۔ جس سے مسلمانوں کی ایک نئی قوم پیدا ہو گئی۔"

افکار اقبال کی بدیں گونہ تعبیرات ہی نے اقبال کے ایمانی اور قرآنی نظریات کو دوراز کار فلسفیانہ بلکہ سوفسطائیانہ نظریات کا علم بردار بنا دیا ہے۔

مقام غور ہے کہ خلوت نشینی میں خود اپنی ذات کے مشاہدہ سے ذاتی صلاحیتوں کا انکشاف، تخلیقی قوتوں کا برسر کار آجانا، عشق کا تحقیقی قوت سے تخلیقی جذبہ میں منتقل ہو جانا اور پھر روحانی طاقت سے کام لے کر نئی دنیا پیدا کرنا اگر مبہمات اور مزخرفات کا ایک طویل سلسلہ نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ کبھی ایسا معاملہ گزرا اور نہ حضورؐ کی رسالت پر کسی تخلیقی قوت کی اصطلاح منطبق ہو سکتی ہے۔ خلوتِ حرا میں حضورؐ کی فطرت پاکیزہ نے جو پایا وہ یہ تھا کہ انسان ایسی مخلوق نہیں جس کا معبود اللہ کے سوا کوئی اور شے ہو سکے۔ یعنی خلوتِ حرا میں معرفتِ نفس، مقدمہ بنا معبودانِ باطلہ کی نفی کا اور خاصہ ہو گیا معرفتِ حق جل مجدہٗ کا جس سے قلب مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر لا الٰہ الا اللہ کا نقش مرتسم ہو گیا اور اس نقش کی تکمیل ہی کا نام نبوت ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقبال کا کارنامہ

علامہ اقبال کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسرارِ قرآنی کے انکشاف میں ایک ایسی مافوق العادت فراست کا ثبوت دیا ہے جس میں کوئی شاعر یا فلسفی ان کا عدیل نہیں ہے۔ یہ عرض کیا گیا ہے کہ وحدانیت ایک ایسا عقیدہ ہے جس کو تمام حسنات کی اصل قرار دینے میں ہر طبقہ کے علمائے الٰہیات نے حقِ ارشاد و تبلیغ ادا کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو کہ تصوّرِ وحدانیت کا منشاء و مبدا ذاتِ حق پر غور کرنے کی بجائے خود اپنی ہستی پر غور کرنا (خودی) ہے؛ جس بے باکی سے اقبالؒ نے بے نقاب کیا ہے وہ اور کسی سے بن نہیں پڑا۔

اُن کا ارشاد ہے ؎

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

——— (زبور عجم ص ۱۶۲)

یعنی خودی بھی جو معرفت حق کا وسیلہ ہے، توفیق الٰہی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ:

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی

یعنی خودی کا ظاہر مقدرۂ نبوت ہے اور باطن منشاءِ وحدانیت ہے۔

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خس چمن مشو
منکرِ حق اگر شُدی منکرِ خویشتن مشو

——— (زبور عجم ص ۸۷)

یعنی معترفِ خویشتن حق سے غافل تو ہو سکتا ہے لیکن ناحق پرست ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اس کے برعکس جو شخص شرفِ انسانیت کے مقام سے نیچے آ کر بالفاظِ اقبال اپنی خودی کی تخریب کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ ذلیل ترین مخلوق سنگ و خشت کو بھی اپنا معبود بنا لینے میں مضائقہ نہیں رکھتا چنانچہ اقبال کا فتوےٰ ہے کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مُنکرِ حق نزدِ ملّا کافر است
مُنکرِ خود نزدِ من کافر تر است

کفر سے بدتر گناہ

دینی اعتبار سے شرک کا درجہ کفر سے بدتر ہے اور مُشرک وہی ہو سکتا ہے جس نے خود کو نہ سمجھا یا اپنی خودی کی تخریب پر آمادہ ہوا۔ اِسی بنا پر کفر و اسلام کا فرق ان کے نزدیک یہ ہے کہ :

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

یعنی کافر خود کو دنیا کے لئے سمجھتا ہے اور مومن دنیا کو اپنے لئے جانتا ہے۔ اس لئے وہ انسانیت کو دنیا کے حصول میں ضائع نہیں کرتا۔ اقبال نے اس نقطۂ نظر کی مذمّت فرمائی ہے ؎

بینی جہاں را خود را نہ بینی
تا چند ناداں غافل نشینی ؟

———— (زبور عجم صد ۱۶۴)

قرآن حکیم کے اس نکتۂ معرفت کو جن گہری نگاہوں سے علامہ اقبال نے دیکھا ہے۔ یقیناً کسی اور نے نہیں دیکھا اور اگر دیکھا ہے تو جس خوبی سے اس کا انکشاف شعرِ اقبال میں کیا گیا ہے۔ شاید ہی کسی سے بن پڑا ہو۔ ان کا یہ دعوےٰ بجا ہے۔

گوہرِ دریائے قرآں سُفتہ ام
شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

نکتہ ھائے خاطر افروزے کہ گفت ؟
با مسلمان حرف دلسوزے کہ گفت ؟

ھم چونے نالیدم اندر کوہ و دشت
تا مقامِ خویش بر من فاش گشت

مقامِ خویش کا فاش ہونا ہی معرفتِ نفس ہے اور معرفتِ نفس ہی سے توحید کا سبق ملتا ہے شعرِ اقبال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں فکری ابلیس دہقنی خدا پرستی کو اتنی اہمیت نہیں دی، جتنی تعلیم خود شناسی کو دی ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خدا سے غافل انسان زیادہ سے زیادہ الحاد کے گڑھے میں گر سکتا ہے۔ لیکن خودی سے بے بہرہ ہونا انسان کو شرک کی غلاظتوں میں پھینک دیتا ہے۔ "منکر خود نزد من کافر تراست۔" کا یہی مقصد ہے۔

زمن گیر اینکہ مردے کور چشمے
زبینائے غلط بینے نکو تر
زمن گیر اینکہ نادانے نکو کیش
زدانش مندِ بے دینے نکو تر

یعنی اندھا آدمی اس سے بہتر ہے جو دیکھتا تو ہے لیکن غلط دیکھتا ہے، چنانچہ راہ راست پر چلنے والا نادان، غلط راہ پر چلنے والے دانشمند سے بہتر ہے۔

پیغمبر بے جبرائیل

غرض معرفت حق سے بے نصیب انسان بہرحال ناحق پرستوں سے اچھا ہے۔ کیونکہ اللہ کو نہ پہچاننے والا بھی مرتبہ لا الٰہ پر فائز ہے گو الا اللہ سے بے بہرہ ہے لیکن غیر اللہ کا پرستار نہ لا الٰہ کے مقام پر ہے اور نہ الا اللہ کے مقام پر۔ چنانچہ مشہور یہودی کارل مارکس جو خدا کا منکر اور نظریہ اشتراکیت کا بانی تھا۔ اقبالؒ نے اسے پیغمبر ناحق شناس کا لقب دیا ہے۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرائیل

زانکہ حق در باطنِ او مضمر است
قلبِ او مومن دماغش کافر است

دین آن پیغمبرِ ناحق شناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لا و الا

قلب کا مومن ہونا یہ ہے کہ انسان بالجزم غلامی غیر سے بغاوت کرے اور دماغ کا کافر ہونا یہ ہے کہ حق کی معبودیت کو نہ جانے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ لا الٰہ کے مقام سے آگے نہ بڑھنا اگرچہ انسان کے عنصری مدارج کو احسن التقویم کا مرتبہ بخشتا ہے۔ لیکن آلودگیٔ کفر کے باعث اسفل السافلین میں ڈال دیتا ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ اقوام میں سے اشتراکی ملک روس کے باب میں اقبالؒ کہتے ہیں۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطین لا کلیسا لا الٰہ
فکرِ او در تُندِ بادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے الا نہ راند

یعنی یہ لوگ سلطان اور مذہب کے ساتھ اللہ سے بھی بیزار ہیں۔ لیکن اقبالؒ کا کہنا ہے کہ:

در مقامِ لا نیا ساید حیات
سوئے الا مے خرامد کائنات

یعنی ہر چند کہ اس بیزاری سے ان کے اجسام مطمئن ہوں۔ روحِ حیات مطمئن نہیں ہو سکتی۔

وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ
لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

اقبال جس طرح خالی لا الٰہ سے بیزار ہیں اسی طرح خالی الا اللہ سے بھی شکوہ طراز ہیں۔

شرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید از حق رمید

یعنی مشرق خالی الا اللہ کا قائل ہے اور مغرب خالی لا الٰہ کا، حالانکہ تکمیل خودی کلمہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لا الٰہ الاّ اللہ کے بغیر ممکن نہیں۔

نہاد زندگی میں ابتدا "لا" انتہا الّا
پیامِ موت ہے جب "لا" ہوا "الّا" سے بیگانہ

لا بغیر الّا

حقیقت یہ ہے کہ کلمہ لا الٰہ الاّ اللہ کے دونوں اجزا اجتماعی و امتزاجی حیثیت میں جہاں ایک طرف مادی وروحانی مدارج کمال کے زینے ہیں۔ وہاں انفرادی و انقطاعی صورت میں ان مقاصد کا سرچشمہ ہیں۔ جو انسانیت کو مرتبہ احسن التقویم سے قعر اسفل السافلین میں دھکیل دیتے ہیں۔ لا الٰہ کا تصور درخت خودی کا ایک ایسا بیج ہے جس کو الاّ اللہ کی آبیاری میسر ہو تو اس سے انسانی فضل و شرف کی کونپلیں پھوٹ نکلتی ہیں اور وہ تمام ملکات فاضلہ یک بیک اُبھر آتے ہیں۔ جو انسان کی فطرت سلیمہ میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ مثلاً مسئلۂ تسخیر کائنات، بلندیٔ عزائم، لاخوفی، اختیارِ مخاطرہ، حرکتِ متصل، ذوقِ جستجو، تربیتِ آرزو، سعیٔ عمل، منعِ سوال، قوت و شوکت و سلطنت، زکوٰۃ و جہاد اور بالآخر خلافتِ الٰہیہ، لیکن یہی مفہوم لا الٰہ اگر الاّ اللہ کے فیض سے بیگانہ ہو تو بربریت، استبداد، سرمایہ داری، استحصال، ملوکیت، استعمار اور بالآخر کرگسی و کفن دزدی پر منتج ہوتا ہے۔

الّا بغیر لا

اسی طرح الاّ اللہ کا مفہوم لا الٰہ کے ساتھ وابستہ ہو کر محاسن مندرجہ بالا کے علاوہ ملکۂ تنویر باطن، اخلاص، توکل، قناعت، غنا، کفایت، عشق اور حیاتِ بے مرگ کا ذریعہ ہے۔ لیکن یہی تصور الاّ اللہ کا لا الٰہ سے منقطع ہو کر فقید البصری، غفلت، خوف و حزن، خسران، تعطل، تلف کاری، عضوِ بے جا، رہبانیت اور بالآخر مرگ بے ہنگام سے دوچار کر دیتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا، کہ لائے مطلق عقائد قدریہ کی اور الّائے مطلق عقاید جبریہ کی بنیاد ہے۔ یہ دونوں عقیدے اسلام کے خلاف اور انسانیت کی موت ہیں۔ چنانچہ اقبالؒ کہتے ہیں ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہ رومی گفت ما من راہبِ پیر کہ دارم نکتۂ از من فرا گیر
کند ہر قوم پیدا مرگِ خود را ترا تقدیر و مارا کشت تدبیر

(ارمغان حجاز مہ۱۵)

یعنی عقایدِ قدریہ و جبریہ دونوں ہی تباہ کن ہیں۔ اوّل الذکر الّا بغیر لا ہے اور ثانی الذکر لا بغیر الا حالانکہ صحیح خیال یہی ہے کہ "الایمان بین الجبر و القدر" اور اس کا مطلب علامہ ہجویری فرماتے ہیں کہ جبریہ عقیدہ باش و قدریہ عمل۔

واضح ہو کہ شعرِ اقبال کے عنواناتِ مطالب بیشتر یہی ہیں کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال اور حرکات و سکنات میں شائبۂ شرک کو دخل نہ ہونے دے۔ ان کے نزدیک لا الٰہ الّا اللہ کا مقام ہی تکمیلِ خودی کے اس مرتبہ کا نام ہے جہاں پر تمام ما سوا ایک ایک کرکے مٹ جاتے ہیں۔ اور زبانِ کائنات والہانہ پکار اٹھتی ہے۔ محمد رسول اللہ۔ خودی کی جلوتوں میں مصطفائی کی صحیح تعبیر یہی ہے۔

روحِ مطالبِ اقبال

علامہ اقبال کا پیغامِ خودی درحقیقت کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اعلان ہے اقبال نے جو کچھ کہا ہے اس میں حکیم المانوی نطشہ کی تقلید ہے نہ فختے کے فلسفہ کا توارد نہ شوپن ھار کا استنباط ہے اور نہ برگساں کا تتبع۔ کیونکہ اقبال کے جملہ عنواناتِ مطالب میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس کو ان اربابِ حکمت و فلسفہ میں سے کسی ایک نے اختیار کیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سیاقِ عبارت میں کہیں کہیں شعرِ اقبال کو ان فلسفیوں کے طرزِ بیان سے گونہ سطحی مناسبت ہے لیکن جہاں تک روحِ مطالب کا تعلق ہے۔ فکرِ اقبال کو ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔ یہ امر یقیناً افسوسناک ہے کہ مکتبۂ اقبالیات کے بیشتر مقتدر ارکان اقبال کی تعلیمات کو آیاتِ کلامِ الٰہی کی روشنی میں دیکھنے کی بجائے فلاسفۂ مغرب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اہلِ فضل جن کی وسعتِ نظر سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہ بھی ہماری بدقسمتی سے یہ کہتے ہیں کہ

"نطشے۔ فختے برگساں اور ولیم جیمز کے نظریاتِ ماہیتِ وجود بہت کچھ وہی ہیں جو اقبال کی تعلیم میں بھی ملتے ہیں۔ (مقدمہ ترجمان اسرار۔ تالیف آنریبل جسٹس عبدالرحمٰن، نگاشتہ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم صہ۱۵) اِس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح ایک اور جگہ بتایا گیا ہے کہ :

" خودی کی تاسیس میں ص ۱۲۔ اسرار خودی پر جو اشعار ہیں۔ وہ نطشے سے ماخوذ ہیں۔ جس کا فلسفہ یہ تھا کہ عین ذات یا حقیقت وجود ایک انائے ساعی ہے۔ عمل اس کی فطرت ہے۔ اخلاق، عمل اور پیکار اور نشو و نما کے لئے اس نے اپنا غیر یا ماسوا پیدا کیا تاکہ امکان پیکار اور اس کے ذریعہ امکان ارتقاء ممکن ہو جائے۔"

ایک متوازن فراست اس تقریر کا مدعا سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اگر فی الواقع علامہ اقبال نے بھی اپنے اشعار میں کچھ ایسی ہی ناقابل فہم اور بے سر و پا باتیں کہی ہیں تو یقیناً وہ بھی نطشے کے شاگرد تھے۔ لیکن پھر یہ نہ کہنا چاہیئے کہ کلام اقبال مطالب قرآن کا ترجمان ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے اسی کتاب میں نہایت دردمندی کے ساتھ یوں فرمایا ہے کہ ۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است / در بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن / ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم / اہلِ ملت را نگہدار از شرم
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا / بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اقبال کی اس دردمندانہ مناجات کے پیش نظر ان کو نطشے کا ہمنوا قرار دینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ اسرارِ خودی کے جن اشعار کو نطشے سے ماخوذ فرمایا گیا ہے، ان کا عنوان یہ ہے ۔

" در بیانِ ایں کہ اصل نظامِ عالم از خودی است و تسلسلِ حیات و تعیناتِ وجود بر استحکام خودی انحصار دارد ۔"

یعنی نظامِ عالم کی بنیاد خودی ہے۔ نیز زندگی کا سلسلہ اور ہستی (اشیائے کائنات) کا تعین خودی کے پائیدار ہونے پر منحصر ہے۔ اس عنوان کا جو مطلب علمائے اقبالیات نے بیان کیا ہے۔ یہ عاجز اس کے سمجھنے سے قاصر ہے اور جو کچھ سمجھ سکا اس کی تائید کسی شارح کے قول سے نہیں ہوتی۔

خودی اور ماہرین اقبالیات

کلامِ اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والوں کے کلام کی سب سے زیادہ مفصل اور نہایت قابل قدر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شرح لکھنے والوں میں اس عاجز کے نزدیک میرے مخلص دوست پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کو اوّلیت حاصل ہے۔ جنہوں نے کلام اقبال کی مشکلات کو حل فرمانے میں تحقیق و تفہیم کا حق ادا فرمایا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ اس عنوان میں خودی سے مراد "انائے مطلق" خدا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عاجز 'انائے سافلی' اور 'انائے مطلق' ہی کے معنی نہ سمجھ سکا تو آگے کیا چل سکتا ہے۔ پھر یہ امر بھی بظاہر ناقابلِ فہم ہے کہ آخر خدا کو 'خودی' سے تعبیر کرنے کی توجیہہ یا اس کی ضرورت کیا تھی؟ "اصل نظام عالم از خدا است" یہ کہنے میں کیا قباحت تھی۔ اور "اصل نظام عالم از خودی است" کہنے میں کونسا حسنِ معنے جلوہ افروز ہوا۔ علاوہ اس کے ان اشعار میں کہا گیا ہے کہ خودی بیدار ہوئی۔ اس نے دشمنی کا بیج بویا۔ اپنی ہستی کو غیر خویشتن تصوّر کر لیا۔ پھر یہ کہ اپنی ذات سے غیروں کی شکل بنائی۔ پھر اپنی قوت کا اندازہ لگانے کے لئے مار دھاڑ شروع کر دی۔ آیا ان امور کو ذات و صفاتِ باری تعالےٰ سے کیا نسبت ہے اور ان لایعنی تصورات کو باری تعالےٰ کی ہستی پر منطبق کرنا کیا ضروری ہے؟ اور اس سے کیا فائدہ؟ ان خلفشاروں کا کوئی جواب اس نظم کی شرحوں میں نہیں ملتا۔ پھر اسی خودی کے بارے میں علامہ اقبال نے تعمیر، تکمیل، تضعیف، تضیع کی تلقین و تحسین اور مذمّت و تقبیح بھی فرمائی ہے۔ تو اُسے خدا قرار دینے کی بجائے کاغذ کی گڑیا یا مٹی کا گھروندا کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔

کلام اقبال میں تضاد

بعض اصحاب نے اپنے ضعفِ تفکر اور قلتِ تدبر کی بنا پر اقبال کے کلام میں فکری تضاد کا جو الزام لگایا ہے وہ اس عاجز کے نزدیک صریح ظلم ہے۔ مفہومِ خودی اور اس کی اہمیت جو اقبال کے پیش نظر تھی۔ اس کی تشریح اوپر آ چکی ہے۔ اس عاجز کے نزدیک یہ عنوان اور اس کے تحت جو اشعار ہیں ان میں بھی خودی کا مفہوم نہ انائے مطلق ہے نہ انائے سافلی نہ خدا بلکہ محض خودی کی اہمیت کا اظہار ہے۔ عنوان کا مقصد یہ ہے کہ کائنات کی ہر شئے جب تک اپنی اصل حقیقت یا شخصیت (خودی) پر قائم ہے اس کی ماہیت یا حقیقت برقرار ہے۔ اس سے ہٹی تو اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے لیز دنیا میں جتنی اشیاء موجود ہیں۔ ان سب کا تعیّن و تشخص ان کے تمام ذرات یا (استحکام خودی) پر منحصر ہے۔ اگر وہ ذرات منتشر ہو جائیں تو پھر وہ شے وہی شے نہیں رہتی۔ اس عنوان کے تحت جو اشعار ہیں وہ سب کسی قدر غور طلب عبارت میں اسی مدّعا کے حامل ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ مے بینی ز آثارِ خودی است

یعنی جو کچھ ہم دیکھتے ہیں دراصل وہی ہے جب تک اس کی خودی باقی ہے۔ چنانچہ گٹھلی، گٹھلی ہے جب تک وہ درخت نہیں بنی اور درخت، درخت ہے۔ جب تک کہ مثلاً وہ کرسی نہ بنے۔ پھر کرسی جل جائے تو کوئلہ ہے اور کوئلہ جلنے کے بعد راکھ ہے۔ اس طرح

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

یعنی جب تک کسی شے میں اس کی حقیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ شے اپنے شعور کے ساتھ موجود ہے (یہی بیداریٔ خودی ہے) پھر جب وہ کوئی نئی شے بن جاتی ہے تو اس نئی شے کی خصوصیات اس میں آ جاتی ہیں چنانچہ گٹھلی۔ درخت، کرسی، کوئلہ اور راکھ وغیرہ اشیاء کا ظہور یا تعین بھی خودی (شعور ذاتی) کی موجودگی سے ہے (عالم پندار کا آشکار ہوتا یہی ہے۔) یہ صلاحیتیں جن سے تعینات کا ظہور ہوتا ہے لامحدود ہیں۔ اس لیئے فرمایا کہ

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ اُو
غیرِ او پیداست از اثباتِ اُو

یعنی ہر شے باعتبار تغیرات و تحولات لامحدود ہے اور اس کی ارتقائی منازل اور تنزلاتی ملکات کی کوئی حد نہیں بقول:

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیوان
گر کند میل ایں شود بہ ازیں
ور کند میل آں شود بہ ازاں

(منقول از انوار سہیلی)

اب ظاہر ہے کہ دوسری شے کا وجود پہلی شے کا عدم یا اس کی شکست ہے گویا ایک اصل (یا حقیقت) دوسری اصل (یا حقیقت) کی دشمنی ہے۔ اس عمل اور ردِ عمل کو اقبال نے یوں بیان فرمایا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

در جہاں تخمِ خصومت کاشت است

خویشتن را غیرِ خود پنداشت است

یعنی موجوداتِ عالم میں جو تنوّع ہے۔ وہ نتیجہ ہے۔ اسی شکست و ریخت کا اور مآلِ خودی (یا شعورِ نفس) کی تبدیلی کا، یہی "خصومت ہے" اور خویشتن را غیرِ خود پنداشتن" یہی شکست و ریخت پیکار ہے۔

سازد از خود پیکرِ اغیار را

تا فزاید لذتِ پیکار را

یعنی خودی اپنے نفس سے غیرِ خود پیدا کرتی ہے۔ اور اس طرح اپنے آپ کو بدل کر لذت اندوز ہوتی ہے۔ واضح ہو کہ لذت اندوزی کا موجب وہ پیش نظر ارتقا ہے۔ جو تکمیل خودی سے حاصل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "کمالِ شے نفیِ اوست" ایک اور مقام پر اسی خودی کو خوگرِ پیکار کہا گیا ہے۔

خوگرِ پیکارِ پیہم دیدمش ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

(رموز صفحہ ۱)

یعنی خودی کا خوگرِ پیکار ہونا ہی زندگی ہے۔

می کشد از قوتِ بازوے خویش

تا شود آگاہ از نیروے خویش

یعنی اپنی قوتِ بازو سے کام لے کر خودی اپنے آپ کو بدلتی رہتی ہے اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی صلاحیتیں کس حد تک ہیں۔

خود فریبی ہائے او عینِ حیات

ہمچو گل از خوں وضو عینِ حیات

یعنی خودی (یا معرفتِ نفس) کی خود فریبی یہ ہے کہ وہ اپنی موجودہ حقیقت کو نظر انداز کر کے ایک نئے وجود (یا نئی زندگی) کے حصول کو اپنا مطمعِ نظر بنا لیتی ہے۔ جیسے پھول کہ خون میں نہا کر ہی پھول بنتا ہے۔ اس سے پہلے وہ پھول نہیں ہوتا بلکہ غنچہ یا کونپل یا شاخ یا بیج ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہر یک گل خون صد گلشن کند

از پے یک نغمہ صد شیون کند

یعنی پھول کہ وہ بھی خودی کی ایک ارتقائی منزل ہے۔ سینکڑوں باغ (فیرنگیٔ کائنات) یا (نیکونگیٔ تعیّنات) سے گزر کر معرضِ وجود میں آتا ہے۔ مثلاً تخم۔ کونپل، پودا، شاخ، غنچہ اور پھر پھول۔ دوسرا مصرع اس کی مثال ہے کہ کئی آوازوں کے فنا ہونے سے ایک نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

یک فلک را صد ہلال آوردہ است

بہر حرفے صد مقال آوردہ است

یعنی خودی یا ایک حقیقت آسمان کی مانند ہے جس میں سینکڑوں ہلال بنتے بگڑتے ہیں، یا ادوار سے گزرنا پڑتا ہے گویا ایک حقیقت بے شمار خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ دوسرا مصرع اس کی تمثیل ہے کہ ایک مدعا کو ظاہر کرنے کے لئے بہت کچھ کہنا پڑتا ہے، تب وہ بات پوری ہوتی ہے۔ اس کے آگے کے اشعار بھی اسی مقصد خودی اور اس کے تدریجی عمل کی تفہیمات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً یہ کہ حقیقی جمال حاصل کرنے کے لئے اسراف اور سنگین دلی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اسراف سے مراد صرفِ اوقات اور محنت ہے اور سنگین دلی سے مقصد اختیارِ تب و تعب اور نفس کشی ہے۔ چنانچہ فرہاد حسنِ شیریں سے فیضیاب ہونے کے لئے اپنی جان لڑا دیتا ہے اور آہوئے ختن کو نافہ کے لئے ہلاک کرنا پڑتا ہے۔ پھر یہی خودی یا معرفتِ نفس ہے کہ :

شعلہ ہای او صد ابراہیم سوخت

تا چراغ یک محمدؐ برفروخت

اس شعر میں ابرہیم سے مراد مردِ خودی آگاہ اور خداشناس ہے۔ جس نے اپنی خودی کو بچایا اور غیر خدا کی الوہیت سے "قاطبتہ" انکار کیا اور اس کے لئے اس کو جاں سوز مصائب سے گزرنا پڑا۔ بہت سے اصحاب (یا انبیاء کی بعثت) کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ مدّعا یہ بیان کرنا ہے کہ تکمیلِ خودی یا تکمیلِ ذات کے مدارج سے گزرنا امرِ سریع الحصول یا یسیر الوصول نہیں ہے۔ اس شعر میں خودی کو شعلہ اور بعثت نبوی کو چراغ سے تعبیر کرنا معنی خیز ہے۔ جس سے یہ جتانا مقصود ہے کہ خودی (یعنی کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ) جس قدر سوزناک ہے اُسی قدر نورگستر بھی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تکمیل خودی کے مدارج مختلف ہیں۔

مفہوم خودی کے باب میں اقبال کی تصریح

غرض اس عاجز کے نزدیک اقبال نے اِن تمام اشعار میں خودی (یا نفی شرک و ایجاب توحید) کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ نہ اس کو نطشے کی لغویات سے کوئی نسبت ہے اور نہ خدائی کا بیان ہے۔ ان دونوں باتوں کی تردید خود اقبال نے اس خط میں کردی ہے جو انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کے نام لکھا تھا۔ اس میں وضاحت کے ساتھ نطشہ کی غلط فہمی کا ذکر ہے اور نہایت دیانتداری سے اس امر کا اعتراف فرمایا ہے کہ:

"میں نے مغربی مفکرین کے خیالات اور عقاید کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے اور یہ طریق محض اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ انگلستان کے اہلِ علم میرے افکار کو بآسانی سمجھ سکیں ورنہ اگر میں چاہتا تو قرآنِ حکیم، صوفیائے کرام اور مسلمان حکماء کے افکار سے بھی استدلال کر سکتا تھا۔ . . . . میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسرارِ خودی کا فلسفہ تمام تر مسلمان صوفیاء اور حکماء کے مشاہدات و افکار سے ماخوذ ہے۔"

(منقول از شرح اسرارِ خودی۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب۔ صہ ۱۲۴۔ ۱۲۵)

اب یہ کیسے ممکن ہے کہ اقبال کے اشعار کو نطشے کے خیالات سے ماخوذ بتایا جائے۔ حالانکہ وہ اس سے بیزار تھے۔ بلکہ اُسے دیوانہ کہتے تھے۔ چنانچہ عالمِ بالا میں اپنے مرشد (مولانائے روم) سے ان کی گفتگو سنیئے۔

من بہ رومی گفتم ایں دیوانہ کیست!
گفت ایں فرزانۂ المانوی ست

او بہ لا درماند و تا الّا نہ رفت
در مقامِ عبدہٗ بے گانہ رفت

یعنی مُرشد رومی نے اس نام نہاد دیوانہ (نطشہ) کی بابت مجھے بتایا کہ یہ جرمن کا دانشمند خدا سے منکر اور عبودیت سے بیگانہ ہے۔

غرض یہ کسی طرح درست نہیں کہ اقبالؒ کے خیالات نطشے سے ماخوذ ہیں اور نہ یہی درست ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"کائنات خدا سے نکلی ہے۔" (شرح اسرار خودی ص۳۵۵)

اقبال اور نطشہ

فاضل شارح اسرار و رموز نے اسی خیال کو اصل قرار دے کر عنوان کے تحت اشعار کی شرح فرمائی جو بظاہر دل نشین معلوم ہوتی ہے لیکن فی الحقیقت منشاءِ اقبال کے خلاف ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے مکتوب موسومہ ڈکنس میں یہ وضاحت فرمائی ہے کہ :

"یہ تعلیم حقیقت کے اس مفہوم پر مبنی ہے جو میں نے اپنی مثنوی (اسرار خودی) میں پیش کیا ہے۔ میرے عقیدے میں حقیقت نام ہے شخصیتوں اور خودیوں کے مجموعہ کا اور اُس کی اجتماعی تشکیل کشمکش سے ہوتی ہے اور ایسی کشمکش بالآخر نظم و ارتباط پیدا کر دیتی ہے۔ ارتقائے حیات کے اعلیٰ مدارج اور بقائے شخصی کے حصول کے لئے کشمکش لازم ہے۔ نطشہ بقائے شخصی کا منکر ہے چنانچہ وہ ان لوگوں سے جو اس کے آرزومند ہیں یہ کہتا ہے کیا تم دوشِ زمانہ پر ایک دائمی بار کی صورت میں باقی رہنا چاہتے ہو؟"

اقبال کی اس تصریح کے پیشِ نظر ان کے نظریۂ خودی کی تفسیر اس کے سوا نہیں ہو سکتی جو اوراقِ سابقہ میں پیش کی گئی ہے جب تک کہ اقبال کے نظریۂ خودی کی صحیح تعبیر نہ کی جائے۔ عبارتِ بالا پر سخت اعتراض عاید ہوتا ہے اور اقبال کے مقابلے میں نطشہ کا نظریہ ہی درست معلوم ہوتا ہے۔ اقبال بقائے شخصی کے مدعی ہیں اور نطشہ اس کے خلاف ہے اور اسلام بھی یہی کہتا ہے۔ کہ۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ۔ یعنی تمام اشیائے ارضی فانی ہیں اور اللہ کے سوا کوئی شئے باقی رہنے والی نہیں ہے۔ ان دونوں نظریات کا قوی اور ضعیف ہونا بقا و فنا کی حقیقتِ معتبرہ کے تعین پر موقوت ہے۔ نطشہ کے پیشِ نظر بقا و فنائے جسمانی ہے اور اقبال نے بقا و فنائے روحانی کا ذکر کیا ہے اور چونکہ حقیقی زندگی روحانی زندگی ہی کا نام ہے۔ اس لئے اقبال نے کلام الٰہی کی روشنی میں روحانی زندگی پانے والوں کو مردہ سمجھنے سے منع کیا ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ۔ (آلِ عمران ع۱۷) راہ خدا میں قتل ہو جانے والوں کو مردہ مت سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور خدا انہیں رزق (لازمۂ زندگی) مہیا کرتا ہے۔ اقبال اس کو بقائے دوام شخصی کہتے ہیں اور ان کے کلام میں اسی بقا کا نام تکمیل خودی ہے (یعنی نفی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شرک اور اثبات توحید) قتل فی سبیل اللہ جہاد میں ہلاک ہو جاتے کو کہتے ہیں۔ واضح ہو کہ لفظ "جہاد" کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد بالکفر کو جہاد اصغر اور جہاد بالنفس کو جہاد اکبر سے تعبیر فرمایا ہے۔ نطشہ نہ جہاد بالکفر کا قائل ہے نہ جہاد بالنفس کا اس لئے وہ فنائے جسم ہی کو فنائے مطلق جانتا ہے۔ اِنْ هِیَ اِلَّا حَیٰوتُنَا الدُّنْیَا کے تمام قائلین یہی کہتے ہیں لیکن اقبال، جہاد اور جہاد کے تمام لوازم آرزو، جستجو، سعی، مقصدیت اور جد وجہد میں جان لڑا دینے کو بقائے انسانی کا موجب قرار دیتے ہیں۔ قرآن حکیم نے جس قتل (موت) کو حیات سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک اس کا نام جدائی یا فراق میں وصال ہے۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں عنوان "خودی" کے تحت جو قطعات درج ہیں۔ ان سب کا مفہوم یہی ہے۔

خودی روشن ز نورِ کبریائی است
رسائی ہائے او از نارسائی است
جدائی از مقاماتِ وصالش
وصالش از مقامات جدائی است

وصالِ ما وصال اندر فراق است
کشود ایں گرہ غیر از نظر نیست
گہر گم گشتہ در آغوش دریا ست
ولیکن آب بحر آب گہر نیست

یہ اشعار یقیناً عسیر الفہم ہیں۔ بظاہر اقبال کا مقصد یہ ہے کہ خودی یعنی معرفتِ نفس کی روشنی توحید کے نور سے ہوتی ہے اور اس کی کامیابی کا انحصار اس کی فداکاری پر ہے۔ اس کی فنا عین بقا ہے۔

دوسرے بند میں بھی فراق و وصال کا یہی مقصد ہے جس کی تمثیل یہ ہے کہ موتی اگرچہ دریا سے واصل ہے۔ لیکن اس کی آب و تاب کو پانی نہیں کہا جا سکتا وہ جداگانہ شے ہے۔

تکمیلِ خودی

واضح ہو کہ تکمیل خودی یا توحید کامل کا انحصار جن باتوں پر ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں ان ہی باتوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تلقین و تبلیغ فرمائی ہے۔ قرآن حکیم کی سب سے پہلی آیت الحمد للّٰہ کا مفہوم یہ ہے کہ تمام خوبیوں کا سرچشمہ ذاتِ حق کے سوا اور کسی کو نہ سمجھا جائے۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے ساتھ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کے اعتراف و اعلان کے معنی یہ ہیں کہ بندۂ مومن اللہ کے سوا نہ کسی کو اپنا کارساز تصور کرتا ہے اور نہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ تُم یخش اِلَّا اللہ ہے کہ مردِ مومن اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اقبال نے اپنے کلام میں لاخوفی کا درس دیا ہے اور منعِ سوال کی تلقین فرمائی ہے۔ رموزِ بے خودی میں ان کی ایک نظم کا عنوان ہی یہ ہے کہ:

"یاس و حزن و خوف اُمّ الخبائث است و قاطعِ حیات و توحید ازالۂ ایں امراض خبیثہ مے کند۔"

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

یعنی اللہ کے بندہ کا کسی سے خوف کھانا بھی شرک اور خودی کے منافی ہے۔

قوت ایماں حیات افزا بدت
وردِ "لَا خوفٌ علیھم" باید ت
چوں کلیمے سوی فرعونے رود
قلب او از "لَا تَخَفۡ" محکم شود
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی را رہزن است

اسی طرح "اسرارِ خودی" کا ایک عنوان ہے کہ "خودی از سوال ضعیف می گردد" یعنی سوال جذبہ توحید کو کمزور کرتا ہے کیونکہ سوال کرنا غیر اللہ سے استعانت اور منشاءِ ایاک نستعین کے منافی ہے۔

از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلّی نخلِ سینائے خودی
ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز
آبروئے ملتِ بیضا مریز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی سوال کرنا افرادِ ملتِ اسلامیہ کے لئے ہتک دین کا موجب ہے یا منافیٔ اسلام ہے۔

خودی ملکاتِ فاضلہ کی اصل

علامہ اقبال چونکہ خودی کو نفیٔ شرک کی علت خیال فرماتے تھے اس لئے ان کے نزدیک توحید یا خودی ہی تمام ملکاتِ فاضلہ اور اخلاقِ حسنہ کی جڑ ہے۔ عالم موجودات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ فطری طور پر کائنات کی ہر شے اپنی خودی کے تحفظ و پابرجائی چاہتی ہے۔ چنانچہ دو مادی اشیاء کے ٹکرانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ اس نظریہ کی تائید کرتی ہے کہ اسے اپنا دفاع مقصود ہوتا ہے اور ہر مخالف شے کو جو اس کے تسالمِ اجزا کو منتشر کرنا چاہے۔ دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اقبال نے اس کو نیروئے خودی سے تعبیر فرمایا ہے۔

وا نمودن خویش را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است
چوں حیاتِ عالم از زور خودی است
پس بقدرِ استواری زندگی است

یعنی ہر شے کی بقا کا راز اس کی اپنی قوتِ تحفظ پر منحصر ہے اور اقبال کا کہنا یہ ہے کہ انسانیت کی بقا بھی نیروئے خودی کی رہینِ منت ہے اور یہ نیروئے بقا ان کے نزدیک اس کے سوا نہیں کہ انسان مقامِ عبدیت پر نہایت پائیداری سے قائم رہے۔ اس کا دامن جس قدر غیر اللہ کے ساتھ وابستگی کے داغ سے پاک ہوگا۔ اس قدر اس کا مقامِ خودی بلند اور اس کی قوت ہمہ گیر ہوگی۔

وارداتِ خودی

خودی کی یہ پابرجائی آسان نہیں بلکہ مسلسل عمل، جدوجہد اور تب وتاب کی محتاج ہے؂

خیزد انگیزد پرد تابد رمد
سوزد افروزد کشد میرد دمد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس شعر میں خودی کے مختلف واردات بیان کئے گئے ہیں۔ جن پر اس کی تکمیل کا انحصار ہے۔ یعنی احساس۔ ولولہ، پرواز۔ تاخت، جفاکشی، افادیت، اِفنا۔ فنا اور حیاتِ نو یا لبقائے دوام، اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی میں انہوں نے خودی کے ان مقامات کو حسّی تمثیلات سے واضح فرمایا ہے کہ خودی کی بقا ہی اصل بقا ہے اور اس کی موت ہی اصل موت ہے۔ چند واضح تمثیلات جو انہوں نے اپنے اشعار میں بتائی ہیں یہ ہیں۔ مثلاً قطرہ پایہ جا رہے تو وہ موتی بن جاتا ہے۔ شراب جب تک بہتی رہی اس کی کوئی شکل نہیں ہوتی جب شیشہ میں ٹھہر جائے تو متشکل ہو جاتی ہے۔ پہاڑ ترکِ خودی سے صحرا بن جاتا ہے۔ لہریں جب تک لہریں ہیں۔ پشتِ بحر پر سوار رہتی ہیں (ورنہ فنا ہو جاتی ہیں)۔

مقصدیّت خودی

انہوں نے تحفظ و تکمیل خودی (جس سے مراد ہر جگہ نفی شرک و اثباتِ توحید ہے) کو اصل مقصد قرار دیا ہے اور حیاتِ بے مقصد کی مذمّت فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ "حیاتِ خودی از تخلیق و تولیدِ مقاصد است"۔

آرزو ہنگامہ آرائے خودی
موجِ بے تابے ز دریائے خودی

خودی اور عشق رسولؐ

چونکہ تعینِ مقاصد کا مبداء عشق و محبت ہے۔ اس لئے فرمایا کہ "خودی از عشق و محبت استحکام مے پذیرد"۔ اور عشق و محبت سے مراد بھی تکمیلِ انسانیت کی لگن ہے۔ جس کا اوّلین وسیلہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی محبّت ہے ؎

عاشقی آموز و محبوبے طلب
چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب
شمعِ خود را ھم چو رومی بر فروز
روم را در آتشِ تبریز سوز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہست معشوقے نہاں اندر دلت
چشم اگر داری بیا بنما یمت
در دلِ مُسلم مقامِ مُصطفےٰ است
آبروئے ما ز نامِ مُصطفےٰ است
من چہ گویم از تولّایش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست

یعنی عشقِ رسول میں رومیؒ اور شمس تبریزؒ کی طرح مثالِ شمع جل۔ کیونکہ وہ ذات ہی ایسی ہے جس سے جدا ہو کر خشک لکڑی (اشارہ ہے اُستنِ حنانہ کی طرف) گریہ کناں ہو جاتی ہے۔

خودی کے مراحل

اقبال نے اپنے نظریۂ خودی کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے تربیت خودی کے تین مرحلے بتائے ہیں (اسرارِ خودی صسم) اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی۔

ان کا کہنا ہے کہ اطاعتِ خدا و رسولؐ ہی سے حریت اور قوت ایمانی پیدا ہوتی ہے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار !
مے شود از جبر پیدا اختیار !

جبر سے مراد پابندئ احکام الٰہی ہے اور اختیار سے مقصد اس کے نتیجہ میں روحانی قوت کا حصول ہے۔

خودی کا دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس، متاعِ دنیا کی تحقیر اور اللہ کی بندگی ہے ؎

مرد شو آور زمامِ او بکف
تا شوی گوہر اگر باشی خذف
امتزاجِ ماء و طین تن پرور است
کشتۂ فحشا ہلاکِ منکر است

یعنی نفس پر قابو پانے والا انسان ٹھیکری سے گوہر بن جاتا ہے اور مٹی کا پتلا انسان گناہوں اور ناپسندیدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باتوں میں پڑ کر ہلاک ہو جاتا ہے ؎

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد فارغ از بندِ زن و اولاد شد
مے کند از ماسوا قطعِ نظر مے نہد ساطور بر حلقِ پسر

یعنی غیر اللہ سے قطع تعلق کرنے والا انسان مال اور اولاد میں مبتلا ہو کر نہیں رہ جاتا جس کی قرآنِ حکیم میں مذمت آئی ہے۔

لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۝

بلکہ وہ تو اپنے فرزند کے حلق پر چھری چلانے سے بھی دریغ نہیں کرتا (یہ اشارہ ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے کردار کی طرف کہ وہ فرمان الٰہی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔)

خودی اور عبادت الٰہی

ظاہر ہے کہ عباداتِ الٰہی کی بجا آوری نفی شرک (خودی) کا اوّلین مظاہرہ ہے ؎

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز
روزہ بر جوع و عطش شبخون زند خیبرِ تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت افروز است حج ہجرت آموز و وطن سوز است حج
حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ ہم مساوات آشنا سازد حیات

اقبال نے تکمیل خودی کے دوسرے مرحلہ میں عبادات، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی تلقین فرمائی ہے مشہور حدیث جبرائیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کے ساتھ انہیں ارکانِ چہارگانہ کو بنائے اسلام فرمایا ہے۔

تکمیل خودی کا آخری مرحلہ

تکمیل خودی (یعنی نفی شرک اور اعتراف وحدانیت) کا تیسرا اور آخری مرحلہ نیابت الٰہی کے مقام پر فائز ہونا ہے۔ اس سے مراد پیغمبری ہے ؎

فطرتش معمور و مے خواہد نمود عالمے دیگر بیارد در وجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را / از حرم بیروں کند اصنام را
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر / ہم سپاہی ہم سپہگر ہم امیر
از عصا دستِ سفیدش محکم است / قدرتِ کامل بعلمش توام است
خشک سازد ہیبتِ او نیل را / مے برد از مصر اسرائیل را
از قُم او خیزد اندر گورِ تن / مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن

اقبال نے ان اشعار میں پیغمبران اولوالعزم کے روحانی مقام اور ان کے معجزات کی نشاندہی فرمائی ہے۔ مثلاً کعبہ سے بتوں کا خارج کرنا۔ بشیر و نذیر ہونا آیات عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ اور سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی کا مصداق ہونا معجزات عصا و یدِ بیضا کا حامل ہونا۔ دریائے نیل میں راستہ بنا لینا اور قُم کہہ کر مُردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔ اقبال کے نزدیک یہ سب کچھ تکمیلِ خودی (یعنی مکمل نفی شرک اور کامل خدا پرستی) کے مظاہر ہیں۔

خودی اور پیرویٔ بزرگانِ دین

اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے منازل توحید کو طے کرنے یا راہ سلوک پر گامزن ہونے کے لئے برگزیدگانِ حق کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ضروری ہے۔ رموزِ بے خودی میں اثباتِ مدّعا کے لئے بزرگانِ دین، صوفیائے اسلام اور خدا پرستوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس کتاب میں بتایا ہے کہ

"مسئلہ نفی خودی از مخترعاتِ اقوام مغلوبۂ بنی نوع انسان است۔"

یعنی جو لوگ شکست خوردہ اور احساس کمتری میں مبتلا ہیں وہی انسانی برتری کے احساس سے خالی ہیں۔ جس کا نتیجہ غیر اللہ کا نیازمند ہونا خوف اور مایوسی کا شکار ہو جانا اور توحید کے مقصد عالی کو پس پشت ڈال دینا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک خودی شیری و شاہینی اور خودی سے گزرنا روباہی و گنجشکی سے مترادف ہے۔

خودی اور بے خودی

واضح ہو کہ ترکِ خودی صوفیا کے نزدیک سلوک کی آخری منزل ہے۔ اقبال نے ترکِ خودی یا بے خودی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے رمز کو ایک نئے پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔

تو خودی از بے خودی نشناختی
خویش را اندر گماں انداختی

یعنی لوگ بے خودی کا مفہوم نہیں سمجھتے اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ:

در جماعت خود شکن گردد خودی
تاز گلبرگے چمن گردد خودی

یہاں خودی کے معنی اہل خودی کے ہیں اور شعر کا مدّعا یہ ہے کہ خودی آگاہ انسان اپنی انفرادی حیثیت کو جماعت میں سمولیتا ہے تاکہ پھول کی پنکھڑی کی بجائے وہ باغ بن جائے۔ اِسی کو انہوں نے ارتباطِ فرد با ملّت سے تعبیر فرمایا ہے۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہر اُو را کمال از ملّت است
تا توانی با جماعت یار باش
رونقِ ہنگامۂ احرار باش

اقبالؒ کے نزدیک احرار سے مراد بھی مردانِ خودی آگاہ ہیں۔

از خودی غافل نہ گردد مردِ حُر
حفظِ خود کن حَبِّ افیونش مخور

(مثنوی مسافر ص۳۴)

یعنی خدا پرست وہی ہے جو اپنی خودی سے غافل یعنی شرک میں آلودہ نہ ہو۔ خودی کا خود شکن ہونا جماعت احرار میں شامل ہونا ہے۔ اور خودی کا تحفظ نہ کرنا افیون کی گولی کھا لینے کے برابر ہے۔

فضائل خودی کے حسّی دلائل

واضح ہو کہ اقبال نے تصوّر خودی کی اہمیّت کو جہاں حسّی دلائل سے ثابت کیا ہے وہاں حسّی اور مادی تمثیلات سے بھی خودی کی پائیداری اور استحکام کو تمام ملکات فاضلہ اور اخلاق حسنہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس قسم کے دلائل کو برہانِ شعری یا حسن التعلیل سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس میں اگرچہ منطقی استدلال یا ایمانی حقائق کی قوت نہیں ہوتی تاہم وہ ایک طرف تو شاعر کے اپنے نظریات کی پختگی کا ثبوت اور دوسری طرف دل نشینی کا موجب ہوتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں اوپر آچکی ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کا قطعہ بعنوان "تیاتر" بھی ہے۔ (زبورِ عجم۔ صـ۱۴۱)

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے اسی کا سُرور و سوز و ثبات
حریم تیری خودی غیر کی معاذاللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تُو نہ رہے
رہا نہ تُو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

دین داروں کے نزدیک تھیٹر اور ڈراما وغیرہ کو اس لئے معیوب سمجھا جاتا ہے کہ یہ مشاغل لہو ولعب میں داخل تضییع اوقات اور مخربِ اخلاق ہیں۔ لیکن اقبال اس کی مذمت اس لئے کرتے ہیں کہ اداکار اس میں اپنی شخصیت یا خودی کو بالائے طاق رکھ کر کوئی اور شخصیت اختیار کر لیتا ہے۔ بسا اوقات مرد عورت کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور عورت مرد کے روپ میں نظر آتی ہے۔ یا افرادِ تمثیل اپنے فطری اور ذاتی کردار کے علاوہ کوئی اور کردار پیش کرتے ہیں۔ یہ عمل ایسا ہی ہے کہ انسان اپنے فطری شرف کو نظر انداز کر کے کائنات کی حقیر اشیاء کے سامنے جو دراصل اس کی خدمت گزار ہیں۔ سربسجود ہو جائے۔ ہر چند کہ تمثیل میں یہ نقالی، وقتی اور عارضی ہوتی ہے اور حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ تاہم اقبال، جھوٹ موٹ کو بھی انسانی خودی کا ضیاع گوارا نہیں کرتے اور حدیث "ایاکم ومواضع التھمۃ" کا بھی یہی منشاء ہے، کہ انسان کو ان مواقع سے بھی بچنا چاہیئے۔ جہاں جھوٹ موٹ کا ہی الزام عاید ہو سکے۔ بالآخر ایک بار پھر یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ اقبال کی تمام ادبی تخلیقات کو کلامِ الٰہی کی روشنی میں دیکھنے والا بے تامل یہی کہے گا کہ شعرِ اقبال میں اگر "خودی" نام کا کوئی فلسفہ ہے تو وہ فلسفہ نہیں بلکہ محض کلمہ طیبہ "لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تعبیر و تصریح ہے۔ یہی "تفسیر خودی" ہے اور یہ کہنا سخت دشوار ہے کہ اہل مغرب نے کلمۂ طیبہ کو کسی عصر میں بھی اپنے نظریات کی اساس قرار دیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکتا ہے کہ ممکن ہے اقبال کے بعض خیالات کو ان فلاسفہ سے کسی حد تک معنوی مناسبت بھی ہو، لیکن خودی کی تربیت کا یہ نتیجہ کہ ؎

شعلۂ یاری او صد ابراہیم سوخت
تا چراغِ یک محمد برفروخت

یعنی خودی اپنے مدارج کو طے کرتی ہوئی بالآخر ایک ایسے نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے۔ جہاں ارتقائی منازل کی تمام بلندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ یقیناً ایک ایسا خیال ہے جو المانوی حکما اور ان کے ہم خیال فلسفیوں کی دست رس سے بالاتر ہے۔

"لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ"

© rasailojaraid.com